

غامدی صاحب کے تصور سنت پر اعتراضات کا جائزہ

ماہنامہ ”الشریعہ“ کے ستمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں جناب حافظ محمد زبیر کا مضمون ”غامدی صاحب کے تصور سنت کا تنقیدی جائزہ“ شائع ہوا تھا جواب ان کی تصنیف ”فکر غامدی ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ“ کا حصہ ہے۔ اس مضمون میں فاضل ناقد نے یہ بیان کیا ہے کہ سنت کے تصور، اس کے تعین، اس کے مصداق اور اس کے ثبوت کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف عقل و نقل کی روشنی میں درست نہیں ہے۔ اس موضوع پر ایک اور تنقیدی مضمون ”الشریعہ“ ہی کے جون ۲۰۰۸ء کے شمارے میں بھی شائع ہوا ہے۔ یہ رسالے کے رئیس التحریر مولانا زاہد الراشدی کی تصنیف ہے۔ ”غامدی صاحب کا تصور سنت“ کے زیر عنوان اس مضمون میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ سنت کے بارے میں غامدی صاحب کا تصور جمہور امت، بالخصوص خیر القرون کے اجماعی تعامل کے منافی ہے اور عملاً سنت کے حجت ہونے سے انکار کے مترادف ہے۔ ان مضامین کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ دونوں مضامین سنت کے بارے میں غامدی صاحب کے نقطہ نظر سے ناواقفیت اور اس کے سوء فہم پر مبنی ہیں۔ اس تحریر میں ہم حافظ زبیر صاحب کے جملہ اعتراضات کے حوالے سے بحث کریں گے۔ ان کا مضمون تفصیلی بھی ہے اور کم و بیش ان تمام اعتراضات کا احاطہ کرتا ہے جو مولانا زاہد الراشدی نے اٹھائے ہیں۔ مزید براں یہ اسی سلسلہ مباحث کا حصہ ہے جس پر ان کے ساتھ بحث و تہیص کا سلسلہ جاری ہے۔ اس میں ہم اپنے فہم کی حد تک غامدی صاحب کے تصور سنت کو بیان کریں گے، اس موضوع پر اہل علم کی آرا کی تنقیح کریں گے اور عقل و نقل کی روشنی میں فاضل ناقدین کی تنقیدات کا جائزہ لیں گے۔ مباحث کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ غامدی صاحب کا تصور سنت

۲۔ غامدی صاحب کے تصور سنت پر اعتراضات کا جائزہ

۳۔ سنت کے ثبوت کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف پر اعتراضات کا جائزہ

۴۔ سنت کی اصطلاح کے حوالے سے غامدی صاحب اورائمہ سلف کے موقف کا فرق

غامدی صاحب کا تصور سنت

سنت کے بارے میں جناب جاوید احمد غامدی کا تصور یہ ہے کہ یہ دین ابراہیمی کی روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اسے دین کی حیثیت سے امت میں جاری فرمایا ہے۔ اس کا پس منظر ان کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دین کے بنیادی حقائق اس کی فطرت میں ودیعت کر کے دنیا میں بھیجا۔ پھر اس کی ہدایت کی ضرورتوں کے پیش نظر انبیا کا سلسلہ جاری فرمایا۔ یہ انبیا وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے اور بنی آدم تک ان کے پروردگار کا دین پہنچاتے رہے۔ یہ دین ہمیشہ دو اجزا پر مشتمل رہا: ایک حکمت، یعنی دین کی مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی اصلاحات اور دوسرے شریعت، یعنی اس کے مراسم اور حدود و قیود۔ حکمت ہر طرح کے تغیرات سے بالاتر رہی، لہذا وہ ہمیشہ ایک رہی۔ لیکن شریعت کا معاملہ قدرے مختلف رہا۔ وہ ہر قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے اترتی رہی، لہذا انسانی تمدن میں ارتقا اور تغیر کے باعث بہت کچھ مختلف بھی رہی۔ مختلف اقوام میں انبیا کی بعثت کے ساتھ شریعت میں ارتقا و تغیر کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نبوت میں پوری انسانیت کے لیے اس کے احکام بہت حد تک متعین ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں اسحاق اور اسماعیل علیہما السلام کو اسی دین کی پیروی کی وصیت کی اور سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بھی بنی اسرائیل کو اسی پر عمل پیرا رہنے کی ہدایت کی:

وَمَنْ يَرْغُبْ عَنْ مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ
نَفْسَهٗ... وَوَصٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيَهٗ
وَيَعْقُوْبُ. (البقرہ ۲: ۱۳۰، ۱۳۲)

”اور کون ہے جو ملت ابراہیم سے اعراض کر سکے،
مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے...
اور ابراہیم نے اسی (ملت) کی وصیت اپنے بیٹوں کو
کی اور (اسی کی وصیت) یعقوب نے (اپنے بیٹوں
کو) کی۔“

دین ابراہیمی کے احکام ذریت ابراہیم کی دونوں شاخوں، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل میں نسلاً بعد نسل ایک دینی روایت کے طور پر جاری رہے۔ بنی اسماعیل میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ کو بھی دین ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا گیا۔ سورہ نحل میں ارشاد فرمایا ہے:

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا،
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. (۱۲۳:۱۶)
”پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دین ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا گیا تو عبادات، معاشرت، خور و نوش اور رسوم و آداب سے متعلق دین ابراہیمی کے یہ احکام پہلے سے رائج تھے اور بنی اسماعیل ان سے ایک معلوم و متعین روایت کی حیثیت سے پوری طرح متعارف تھے۔ بنی اسماعیل بڑی حد تک ان پر عمل پیرا بھی تھے۔ دین ابراہیمی کے یہی معلوم و متعارف اور رائج احکام ہیں جنہیں اصطلاح میں ’سنت‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجدید و اصلاح کے بعد اور ان میں بعض اضافوں کے ساتھ انہیں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔

یہ جناب جاوید احمد غامدی کا سنت کے بارے میں تصور ہے۔ یہ تصور ان کی کتاب ”میزان“ کے مقدمے ”اصول و مبادی“ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تمہید میں انہوں نے دین کے ماخذ کی بحث کرتے ہوئے سنت کے بارے میں اپنا اصولی موقف ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”...رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں

میں ہم تک پہنچا ہے:

۱۔ قرآن مجید

۲۔ سنت

...سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تجدید و اصلاح کے

بعد اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔“

(میزان ۱۳-۱۴)

اسی مقدمے میں ایک مقام پر انہوں نے سنت کے اس تصور کے پس منظر کو بیان کیا ہے۔ ”مبادی تدبر قرآن“ کے تحت فہم قرآن کے اصول بیان کرتے ہوئے ”دین کی آخری کتاب“ کے زیر عنوان یہ واضح کیا ہے کہ قرآن جس دین کو پیش کرتا ہے، تاریخی طور پر وہ اس کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے۔ دین فطرت، ملت ابراہیمی کی روایت

اور نبیوں کے صحائف تاریخی لحاظ سے اس سے مقدم ہیں۔ لکھتے ہیں:

”...دین کی تاریخ یہ ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجا تو اُس کے بنیادی حقائق ابتدا ہی سے اُس کی فطرت میں ودیعت کر دیے۔ پھر اُس کے ابوالآباد آدم علیہ السلام کی وساطت سے اُسے بتا دیا گیا کہ اولاً، اُس کا ایک خالق ہے جس نے اُسے وجود بخشا ہے، وہی اُس کا مالک ہے اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر تنہا وہی ہے جسے اُس کا معبود ہونا چاہیے۔ ثانیاً، وہ اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس کے لیے خیر و شر کے راستے نہایت واضح شعور کے ساتھ اُسے سمجھا دیے گئے ہیں۔ پھر اُسے ارادہ و اختیار ہی نہیں، زمین کا اقتدار بھی دیا گیا ہے۔ اُس کا یہ امتحان دنیا میں اُس کی زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہے گا۔ وہ اگر اس میں کامیاب رہا تو اس کے صلے میں خدا کی ابدی بادشاہی اُسے حاصل ہو جائے گی جہاں نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا ہوگا اور نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ثالثاً، اُس کی ضرورتوں کے پیش نظر اُس کا خالق وقتاً فوقتاً اپنی ہدایت اُسے بھیجتا رہے گا، پھر اُس نے اگر اس ہدایت کی پیروی کی تو ہر قسم کی گمراہیوں سے محفوظ رہے گا اور اس سے گریز کا یہ رویہ اختیار کیا تو قیامت میں ابدی شقاوت اُس کا مقدر ٹھہرے گی۔

چنانچہ پروردگار نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور انسانوں ہی میں سے کچھ ہستیوں کو منتخب کر کے اُن کے ذریعے سے اپنی یہ ہدایت بنی آدم کو پہنچائی۔ اس میں حکمت بھی تھی اور شریعت بھی۔ حکمت، ظاہر ہے کہ ہر طرح کے تغیرات سے بالا تھی، لیکن شریعت کا معاملہ یہ نہ تھا۔ وہ ہر قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے اترتی رہی، یہاں تک کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نبوت میں پوری انسانیت کے لیے اُس کے احکام بہت حد تک ایک واضح سنت کی صورت اختیار کر گئے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جب بنی اسرائیل کی ایک باقاعدہ حکومت قائم ہو جانے کا مرحلہ آیا تو تورات نازل ہوئی اور اجتماعی زندگی سے متعلق شریعت کے احکام بھی اترے۔ اس عرصے میں حکمت کے بعض پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو زبور اور انجیل کے ذریعے سے اُنھیں نمایاں کیا گیا۔ پھر ان کتابوں کے متن جب اپنی اصل زبان میں باقی نہیں رہے تو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث کیا اور اُنھیں یہ قرآن دیا۔...

یہ دین کی تاریخ ہے۔ چنانچہ قرآن کی دعوت اس کے پیش نظر جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ فطرت کے حقائق

۲۔ دین ابراہیمی کی روایت

۳۔ نبیوں کے صحائف۔“ (میزان ۴۳-۴۵)

بنی اسماعیل میں دین ابراہیمی کی روایت

جناب جاوید احمد غامدی کا موقف یہ ہے کہ عربوں کے ہاں دین ابراہیمی کی روایت پوری طرح مسلم تھی۔ لوگ بعض تحریفات کے ساتھ کم و بیش وہ تمام امور انجام دیتے تھے جنہیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جاری کیا تھا اور جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تصویب سے امت میں سنت کی حیثیت سے جاری فرمایا۔ چنانچہ ان کے نزدیک نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نماز جنازہ، جمعہ، قربانی، اعتکاف اور ختنہ جیسی سنتیں دین ابراہیمی کے طور پر قریش میں معلوم و معروف تھیں۔ لکھتے ہیں:

”...نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، یہ سب اسی ملت کے احکام ہیں جن سے قرآن کے مخاطب پوری طرح واقف، بلکہ بڑی حد تک اُن پر عامل تھے۔ سیدنا ابوذکر کے ایمان لانے کی جو روایت مسلم میں بیان ہوئی ہے، اُس میں وہ صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی وہ نماز کے پابند ہو چکے تھے۔ جمعہ کی اقامت کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ قرآن کے مخاطبین کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ نماز جنازہ وہ پڑھتے تھے۔ روزہ اُسی طرح رکھتے تھے، جس طرح اب ہم دیکھتے ہیں۔ زکوٰۃ اُن کے ہاں بالکل اُسی طرح ایک متعین حق تھی، جس طرح اب متعین ہے۔ حج و عمرہ سے متعلق ہر صاحب علم اس حقیقت کو جانتا ہے کہ قریش نے چند بدعتیں اُن میں بے شک داخل کر دی تھیں، لیکن اُن کے مناسک فی الجملہ وہی تھے جن کے مطابق یہ عبادات اس وقت ادا کی جاتی ہیں، بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان بدعتوں پر متنبہ بھی تھے۔ چنانچہ بخاری و مسلم، دونوں میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے جو حج کیا، وہ قریش کی ان بدعتوں سے الگ رہ کر بالکل اُسی طریقے پر کیا، جس طریقے پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج ہمیشہ جاری رہا ہے۔

یہی معاملہ قربانی، اعتکاف، ختنہ اور بعض دوسرے رسوم و آداب کا ہے۔ یہ سب چیزیں پہلے سے رائج، معلوم و متعین اور نسلاً بعد نسل جاری ایک روایت کی حیثیت سے پوری طرح متعارف تھیں۔ چنانچہ اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ قرآن ان کی تفصیل کرتا۔ لغت عرب میں جو الفاظ ان کے لیے مستعمل تھے، اُن کا مصداق لوگوں کے سامنے موجود تھا۔ قرآن نے انہیں نماز قائم کرنے یا زکوٰۃ ادا کرنے یا روزہ رکھنے یا حج و عمرہ کے لیے آنے کا حکم دیا تو وہ جانتے تھے کہ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج و عمرہ کن چیزوں کے نام ہیں۔“

(میزان ۴۵-۴۶)

غامدی صاحب کے تصور سنت پر اعتراضات کا جائزہ

فاضل ناقد نے اپنے مضمون میں غامدی صاحب کے تصور سنت پر بنیادی طور پر یہ تنقید کی ہے کہ غامدی صاحب کا سنت کو ملت ابراہیمی کی روایت کا حصہ قرار دینا اور اس بنا پر اسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نسبت سے بیان کرنا عقل و نقل کی روشنی میں درست نہیں ہے۔ فاضل ناقد نے اس تنقید کو چار مختلف پہلوؤں سے پیش کیا ہے۔ ذیل میں ان کا خلاصہ اور ان کے بارے میں ہمارا تبصرہ پیش ہے۔

’ملت‘ کا مفہوم

فاضل ناقد نے پہلا اعتراض یہ کیا ہے کہ غامدی صاحب کا سورہ نحل (۱۶) کی آیت ۱۲۳ کے الفاظ ’اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا‘ میں لفظ ’مِلَّةَ‘ کا ترجمہ ’سنت‘ کرنا درست نہیں ہے۔ یہ ترجمہ قرآن مجید کے عرف اور عربی زبان کے مسلمات کے خلاف ہے۔ اس آیت میں ملت کا لفظ توحید اور شرک سے اجتناب اور اطاعت الہی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے سنت کا مفہوم واضح نہیں لیا جاسکتا۔ چنانچہ غامدی صاحب کا اس آیت کو سنت کی دلیل کے طور پر پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

”غامدی صاحب نے اپنی بیان کردہ تعریف سنت کے ثبوت کے لیے سورۃ النحل کی درج ذیل آیت کو بطور دلیل بیان کیا ہے:

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ
حَنِيفًا، وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ.
”پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ آپ حضرت
ابراہیم کی ملت کی پیروی کریں جو بالکل یک سو تھے
(النحل: ۱۶: ۱۲۳) اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔“

غامدی صاحب بحث ’سنت‘ کی کر رہے ہیں اور دلیل ایک ایسی آیت کو بنا رہے ہیں جس میں لفظ ’ملت‘ استعمال ہوا ہے، حالانکہ یہاں پر ’ملت ابراہیم‘ سے مراد بالکل بھی سنت ابراہیمی (وہ ستائیس چیزیں جو کہ غامدی صاحب نے بیان کی ہیں) نہیں ہے۔ ’سنت‘ کا لفظ جزئیات پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نماز میں ہاتھ باندھنا سنت ہے، جبکہ ملت کے لفظ کا اطلاق جزئیات پر نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہنا غلط ہوگا کہ نماز میں ہاتھ باندھنا ملت

ہے، کیونکہ 'سنت' کے لفظ کی نسبت جزئیات کی طرف ہو جاتی ہے جبکہ 'ملت' کی نسبت جزئی امور کی طرف نہیں ہوتی بلکہ اجتماعی یا مجموعی امور کی طرف ہوتی ہے۔... ملت کا لفظ قرآن میں معمولی سے فرق کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں 'ملت ابراہیم' سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی وہ مجموعی ہیئت ہے جو کہ دین اسلام کی بنیادی اور تمام انبیاء کے ہاں متفق علیہ تعلیمات پر عمل کرنے، خصوصاً ہر قسم کے شرک سے اجتناب کرنے اور اللہ کا انتہائی درجے میں فرماں بردار ہو جانے کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔... لفظ ملت کا ترجمہ 'دین' تو کیا جاسکتا ہے... اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کا اصل معنی بھی اطاعت اور فرمانبرداری ہی ہے، لیکن ملت کا ترجمہ 'سنت' کسی طرح نہیں بنتا۔... لفظ ملت کا ترجمہ 'سنت' سے کرنا عربی زبان سے لاعلمی اور قرآنی اصطلاحات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔" (فکر غامدی ۵۲-۵۳، ۵۷)

فاضل ناقد کا یہ اعتراض سنت کے بارے میں "میزان" کے مندرجات کے سوء فہم پر مبنی ہے۔ غامدی صاحب نے "اصول و مبادی" میں جن دو مقامات پر یہ آیت نقل کی ہے، وہاں لفظ ملت کا ترجمہ سنت ہرگز نہیں کیا ہے۔ انھوں نے 'مِلَّةِ اِبْرٰہِیْم' کا ترجمہ 'ملت ابراہیم' ہی کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰہِیْمَ
حَنِیْفًا، وَاَمَّا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ
"پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو
جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔"

(اعل ۱۶: ۱۲۳)

(میزان ۱۴)

جہاں تک ملت کے مفہوم کا تعلق ہے تو ان دونوں مقامات سے واضح ہے کہ ملت ابراہیم سے ان کی مراد دین ابراہیم ہے۔ چنانچہ ان مباحث میں انھوں نے جا بجا "سنت ابراہیمی" کے نہیں، بلکہ "دین ابراہیمی" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ سنت ان کے نزدیک دین ابراہیمی یا ملت ابراہیمی ہی کا ایک جز ہے۔ یہ درحقیقت دین ابراہیم کے ان احکام پر مشتمل ہے جو بنی اسماعیل میں پہلے سے رائج اور معلوم و متعین تھے اور نسل در نسل چلتی ہوئی ایک روایت کی حیثیت سے متعارف تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجدید و اصلاح کی اور ان میں بعض اضافوں کے ساتھ انھیں مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا۔ وہ لکھتے ہیں:

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔" (میزان ۱۴)

”...دین ابراہیمی کی روایت کا یہ حصہ جسے اصطلاح میں سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآن کے نزدیک خدا کا دین ہے اور وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیتا ہے تو گویا اس کو بھی پورا کا پورا اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔“ (میزان ۴۶)

فاضل ناقد کی یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ غامدی صاحب نے سنت کے معنی و مصداق کے لیے مذکورہ آیت کو اصل بنائے استدلال کے طور پر پیش کیا ہے۔ اصول و مبادی کے مندرجات سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ان کے نزدیک یہ آیت فقط اس بات کا حوالہ ہے کہ قرآن کے علاوہ دین ابراہیمی کی روایت کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت میں جاری فرمایا ہے۔

جہاں تک فاضل ناقد کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ ملت کے جامع لفظ سے بطور تائید ہی سہی، سنت کا جزوی مفہوم اخذ کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے تو اس ضمن میں ہماری گزارش یہ ہے کہ زبان و بیان کے مسلمات کی رو سے یہ بھی جائز ہے کہ متکلم کوئی وسیع الاطلاق لفظ یا اصطلاح استعمال کر کے اس کے کسی ایک جز یا ایک اطلاق کو مراد لے رہا ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ مخاطب کسی وسیع الاطلاق لفظ کے جملہ اطلاقات میں سے جو اس کے مفہوم کو پوری طرح شامل ہوں، کسی ایک اطلاق کو بیان کرنے پر اکتفا کرے۔ گویا کل کو بول کر جز بھی مراد لیا جاسکتا ہے اور بولے گئے کل سے اس کے کسی جز پر استدلال بھی کیا جاسکتا ہے۔ تفہیم مدعا کے لیے سورہ بینہ کی درج ذیل آیت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ
الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا
الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ. (۵:۹۸)

”ان (اہل کتاب کو) یہی ہدایت دی گئی تھی کہ وہ
اللہ کی عبادت کریں، اطاعت کو اس کے لیے خالص
کرتے ہوئے، پوری یک سوئی کے ساتھ، اور نماز
قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یہی دینِ قیم (سیدھی
ملت کا دین) ہے۔“

اس آیت کو پڑھ کر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس کی رو سے دینِ قیم کا اطلاق فقط تین چیزوں، یعنی اللہ کی عبادت، نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی پر ہوتا ہے اور عقائد و اعمال کی دیگر چیزیں، مثلاً توحید، رسالت، آخرت، روزہ، حج، اور قربانی وغیرہ دینِ قیم کے اطلاق میں شامل نہیں ہیں تو اس کی بات کو کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جائے گا۔

”لسان العرب“ میں ہے:

سورہ نحل کی مذکورہ آیات میں سیاق و سباق کی رو سے عملی پہلو مراد ہیں۔ اس مقام پر اصل میں ان مشرکانہ بدعات کی تردید کی گئی ہے جو بعض جانوروں کی حرمت کے حوالے سے مشرکین عرب میں رائج تھیں اور جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ انھیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہی نے جاری فرمایا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے طور پر ایک پوری شریعت وضع کر رکھی تھی۔ مثال کے طور پر وہ منتوں اور نذروں کے لیے خاص کیے گئے جانوروں پر اللہ کا نام لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا۔ وہ اپنی کھیتوں اور جانوروں میں سے ایک حصہ اللہ کے لیے مقرر کرتے اور ایک حصہ دیوی دیوتاؤں کے لیے خاص کر دیتے تھے۔ نذروں اور منتوں کے لیے مخصوص جانوروں میں سے مادائیں جو بچہ جنتیں، اس کا گوشت عورتوں کے لیے ناجائز اور مردوں کے لیے جائز تھا، لیکن اگر وہ بچہ مردہ پیدا ہو یا بعد میں مرجائے تو پھر اس کا گوشت عورتوں کے لیے بھی جائز ہو جاتا تھا۔ قرآن مجید نے ان مشرکانہ بدعات اور ان کی سیدنا ابراہیم سے نسبت کی نہایت سختی سے تردید کی۔ یہ اس آیت کا پس منظر ہے۔ اس پس منظر میں اگر آیت کا مطالعہ اس کے سیاق و سباق کے ساتھ کیا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ 'اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ' کا حکم اصل میں عملی احکام ہی کے تناظر میں آیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا
وَأَشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنَّ كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ.
إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ
الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهْلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ... وَلَا
تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ
هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ
الْكَذِبَ... وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا
مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ
وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ... إِنَّ
إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ. شَاكِرًا لِّأَنْعَمِهِ، الْحَنِيفَ
وَهَذِهِ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ... ثُمَّ
أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. إِنَّمَا جُعِلَ
السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ وَإِنَّ رَبَّكَ
لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ
يَخْتَلِفُونَ. (النحل ۱۶-۱۱۴)

”تو اللہ نے تمہیں جو چیزیں جائز و پاکیزہ دے رکھی
ہیں، ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر
تم اسی کی پرستش کرتے ہو۔ اس نے تو تم پر بس مردار
اور خون اور سور کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا
ہو، حرام ٹھہرایا ہے۔... اور اپنی زبانوں کے گھڑے
ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور
فلاں چیز حرام کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ۔... اور جو
یہودی ہوئے، ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کیں
جو ہم نے پہلے تم کو بتائیں اور ہم نے ان پر کوئی ظلم
نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔
بے شک، ابراہیم ایک الگ امت تھے، اللہ کے
فرماں بردار اور اس کی طرف یک سو اور وہ مشرکین
میں سے نہ تھے۔ وہ اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے۔
اللہ نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کی رہنمائی ایک سیدھی
راہ کی طرف فرمائی۔... پھر ہم نے تمہاری طرف وحی
کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھے
اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ سبت انہی لوگوں پر عائد
کیا گیا تھا جنہوں نے اس کے باب میں اختلاف کیا،
اور بے شک، تمہارا رب ان چیزوں کے باب میں جن
میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں، قیامت کے روز ان
کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔“

”اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا“ کی تفسیر میں جلیل القدر اہل علم نے ملت سے فقط اصولی تصورات مراد نہیں لیے، بلکہ
عملی پہلوؤں کو نمایاں طور پر شامل سمجھتے ہوئے اس آیت کی تفسیر کی ہے۔

ابن قیم نے ملت کو توحید کے مفہوم میں لینے کی صریح طور پر تردید کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد دین ہے اور اس کے مفہوم میں عقائد کے ساتھ اعمال بھی شامل ہیں:

واما قولکم ان الملة هي التوحيد
فالملة هي الدين وهي مجموع اقوال
وافعال واعتقاد ودخول الاعمال في
الملة كدخول الايمان فالملة هي
الفطرة وهي الدين ومحال ان يامر الله
سبحانه باتباع ابراهيم في مجرد الكلمة
دون الاعمال وخصال الفطرة.
(ابن القيم، تحفة المولود ۱۰۶)

”تم اگر یہ کہتے ہو کہ ملت سے مراد توحید ہے (تو
یہ درست نہیں ہے)۔ ملت سے مراد دین ہے اور دین
اقوال، افعال اور اعتقاد کے مجموعے کا نام ہے۔ جس
طرح ایمان ملت کے مفہوم میں داخل ہے، اسی طرح
اعمال بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ پس فطرت کا
نام ملت ہے اور وہ دین ہے۔ یہ بات محال ہے کہ
اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعمال اور
عادات فطرت کو چھوڑ کر صرف کلمہ کی پیروی کرنے کا
حکم فرمائیں۔“

امام رازی نے ملت سے شریعت مراد لیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ملت ابراہیم ملت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ ہے:

ظاهر هذه الآية يقتضي ان شرع
محمد عليه الصلوة والسلام نفس شرع
ابراهيم، وعلى هذا التقدير لم يكن
محمد عليه الصلوة والسلام صاحب
شريعة مستقلة، وانتم لا تقولون بذلك.
قلنا: يجوز ان تكون ملة ابراهيم داخله
في ملة محمد عليه الصلوة والسلام
مع اشتمال هذه الملة على زوائد حسنة
وفوائد جليلة. (تفسير كبير ۱/۵۷)

”پھر اگر یہ کہا جائے کہ (آیت کا ظاہر تو اس بات
کا تقاضا کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور
ابراہیم علیہ السلام کی شریعت یکساں ہے اور اس بنا پر تو
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مستقل شریعت کے حامل نہ
ہوئے، جبکہ تم ایسا نہیں کہتے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ بات
درست ہے کہ ملت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ملت ابراہیم
داخل ہے کچھ اچھے زوائد اور بہتر فوائد کے ساتھ۔“

امام ابن حزم نے اسے شریعت کے معنوں میں لیا ہے اور واضح کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی شریعت کو لے کر
آئے جس پر سیدنا ابراہیم عمل پیرا تھے:

”حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت بعینہ وہی شریعت ہے جو ہماری ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ابراہیم علیہ السلام تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی شریعت کے ساتھ تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے جس کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام بالخصوص اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے نہ کہ اپنے ہم عصر تمام لوگوں کی طرف۔ ہم پر ملت ابراہیم کی پیروی لازم ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے ساتھ ہماری طرف بھیجے گئے ہیں، نہ کہ اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام اس کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔“

(ابن حزم، الاحکام ۱۶۵/۲-۱۶۶)

بیضاوی نے ملت ابراہیم سے ملت اسلام کو مراد لیا ہے:

”فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ“ یعنی ملت اسلام (کی پیروی کرو) جو اصل میں ملت ابراہیم ہے یا اس کی مثل ہے۔“

(فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا) ای ملت الاسلام
التي هي في الاصل ملة ابراهيم، او مثل
ملته. (تفسير البيضاوي ۱/۱۲۸)

شاہ ولی اللہ نے حج جیسی عملی عبادت کو فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ہی کے حکم کے تحت شامل کیا ہے:

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملت حنیفیہ ہی کے احیا اور قیام کے لیے ہوئی ہے اور اسی کا بول بالا کرنے کے لیے آپ اس دنیا میں تشریف لائے۔ قرآن مجید میں ہے: ”مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ“ اس لیے یہ ضروری تھا کہ جو مناسک وہ بجالائے ہیں اور ان کی لائی ہوئی شریعت کے شعائر ہیں، ان کو من و عن قائم رکھا جائے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

والنبي صلى الله عليه وسلم بعث لتظهر به الملة الحنيفية وتعلو بها كلمتها، وهو قوله تعالى: (مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ) فمن الواجب المحافظة على ما استفاد عن اماميها كخصال الفطرة ومناسك الحج؛ وهو قوله صلى الله عليه وسلم (قفوا على مشاعركم فانكم

علی ارث من ارث ابراہیم)۔ جب عربوں کو موقف میں دیکھا تو ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”اپنی اپنی جگہ کھڑے رہو، کیونکہ یہ مناسک تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی میراث ہے۔“

(حجۃ اللہ البالغہ ۹۸/۲)

”تفسیر مظہری“ میں شریعت کو ملت کے مفہوم میں شامل کر کے بیان کیا گیا ہے:

والملة كالدين اسم لما شرع الله لعباده
على لسان الانبياء ليتوصلوا بها الى
مدارج القرب وصلاح الدارين.
”ملة“ کا لفظ دین کی طرح ہے اور یہ اس چیز کے
لیے اسم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے
انبیاء کی زبان سے شریعت کے طور پر جاری کیا ہوتا کہ
وہ قرب کے مدارج اور دنیا و آخرت کی صلاح تک پہنچ
سکیں۔“

(۹۴/۲)

(وَاتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ) خص ابراہیم علیہ
السلام بالذکر، مع ان دین الانبياء کلہم
واحد و هو صرف نفسه واعضائه وقواه
ظاہراً او باطناً فی مرضاة اللہ تعالیٰ
مشتغلاً بہ تعالیٰ معرضاً عن غیرہ تعالیٰ
لاتفاق جمیع الامم علی کونہ نبیاً
حقاً حمیداً فی کل دین، ولکون دین
الاسلام موافقاً لشریعة ابراہیم علیہ
السلام فی کثیر من فروع الاعمال كالصلوة
الی الکعبة والطواف بها ومناسک الحج
والختان وحسن الضیافة وغیر ذلك
من کلمات ابتلاہ اللہ تعالیٰ بها فاتمہن.
”وَاتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ“ اس میں حضرت ابراہیم کو
خاص کیا ہے باوجود اس کے کہ تمام انبیاء کا دین ایک
ہی ہے، جبکہ حضرت ابراہیم نے اپنی جان، اپنے اعضا
اور قوی ظاہری اور باطنی طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے
لیے صرف کیے، اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول ہو کر اور
اس کے علاوہ سب سے اعراض کرتے ہوئے، اس
لیے کہ تمام امتوں کا ہر دین کے معاملے میں ان کے
نبی برحق اور محمود ہونے پر اتفاق ہو جائے اور دین اسلام
اعمال کی فروع میں ان کی شریعت کے موافق ہو، جیسا
کہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا، اس کا طواف
کرنا، مناسک حج، ختنہ اور حسن ضیافت اور اس کے
علاوہ وہ کلمات جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے انہیں
آزمایا تو انہوں نے ان کو پورا کر دیا وغیرہ۔“

(تفسیر مظہری ۴۶۱/۲)

”تفسیر عثمانی“ میں حلال و حرام کو ملت کے مفہوم میں شامل تصور کیا گیا ہے:

”... مقصد یہ ہے کہ حلال و حرام اور دین کی باتوں میں اصل ملت ابراہیم ہے۔“ (۳۶۴)

مفتی محمد شفیع کی تفسیر سے واضح ہے کہ وہ شریعت اور احکام کو ملت کے مفہوم میں شامل سمجھتے ہیں:

”حق تعالیٰ نے جو شریعت و احکام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی بعض خاص احکام کے علاوہ اس کے مطابق رکھی گئی۔“ (معارف القرآن ۵/۴۰۵)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ملت ابراہیم کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کی تعبیر اختیار کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”...محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ ملت ابراہیمی میں وہ چیزیں حرام نہ تھیں جو یہودیوں کے ہاں حرام ہیں۔ مثلاً یہودی اونٹ نہیں کھاتے، مگر ملت ابراہیمی میں وہ حلال تھا۔ یہودیوں کے ہاں شتر مرغ، بٹ، خرگوش وغیرہ حرام ہیں، مگر ملت ابراہیمی میں یہ سب چیزیں حلال تھیں۔“ (تفہیم القرآن ۲/۵۸۰)

اس تفصیل سے یہ بات ہر لحاظ سے واضح ہو گئی ہے کہ ملت ابراہیمی سے مراد دین ابراہیمی ہے اور اس کے مشمولات میں فقط اصولی تصورات نہیں، بلکہ احکام و اعمال بھی شامل ہیں۔

ملت ابراہیم کی اتباع

فاضل ناقد نے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ غامدی صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دین ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا تھا۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے احکام محفوظ ہی نہیں تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اتباع کا حکم کیونکر دیا جاسکتا تھا۔ لکھتے ہیں:

”اگر ملت ابراہیمی سے مراد وہ ستائیس اعمال لے بھی لیے جائیں جو کہ غامدی صاحب بیان کر رہے ہیں تو پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین ابراہیمی کی بنیادی عبادات نماز اور مناسک حج وغیرہ بھی محفوظ نہ تھیں چہ جائیکہ باقی اعمال محفوظ رہے ہوں۔ جب دین ابراہیمی ہی محفوظ نہ تھا تو اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اتباع کا حکم دینا کچھ معنی نہیں رکھتا۔“ (فکر غامدی ۵۷)

فاضل ناقد کے پہلے اعتراض کے جواب میں یہ بات ہر لحاظ سے واضح ہو گئی ہے کہ ملت ابراہیمی سے مراد دین ابراہیمی ہے اور اس کے مشمولات میں فقط اصولی تصورات نہیں، بلکہ احکام و اعمال بھی شامل ہیں۔ اس تناظر میں دوسرے اعتراض کے بارے میں ہماری معروضات حسب ذیل نکات پر مبنی ہیں:

اولاً، اس اعتراض کی تردید خود آیت کے اسلوب بیان سے ہو جاتی ہے۔ حکم دیا گیا ہے: **وَاتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ**، یعنی ملت ابراہیم کی پیروی کرو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ اپنے پیغمبر کو یا اپنے بندوں کو کسی ایسی چیز کا حکم دیں جس کا وجود عنقا

ہو، جو غیر محفوظ ہو یا جس کا مصداق مشتبہ ہو۔ اس ضمن میں دلیل قاطع یہ ہے کہ آیت کے اولین مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ عامہ عرب کو ملت ابراہیم کے مختلف احکام کے بارے میں ابہام یا اشکال ہو، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ ہرگز ممکن نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اللہ کے احکام کی تفہیم کے لیے وحی کی مکمل رہنمائی میسر تھی۔ چنانچہ یہ یقینی امر ہے کہ آپ ان سنن کی حقیقی صورتوں سے بھی آگاہ تھے اور ان سے متعلق بدعات اور تحریفات کو بھی پوری طرح جانتے تھے۔

ثانیاً، قرآن مجید میں مختلف سنن کا جس طریقے سے ذکر ہوا ہے، اس سے بھی یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دین ابراہیمی کے سنن اہل عرب میں پوری طرح معلوم و متعارف تھے۔ عرب جاہلی میں دین ابراہیمی کے سنن کوئی اجنبی چیز نہیں تھے۔ ان کی زبان میں صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، نسک کے الفاظ کا وجود بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان عبادات سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ ان کی مذہبی حیثیت، ان کے آداب، ان کے اعمال و اذکار اور حدود و شرائط کو بھی بہت حد تک جانتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے جب ان کا ذکر کیا تو ایسے ہی کیا جیسے کسی معلوم و معروف چیز کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نہ ان کی نوعیت اور ماہیت بیان کی اور نہ ان کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دین ابراہیمی کی ایک روایت کی حیثیت سے یہ جس طرح انجام دی جاتی تھیں، وحی کی رہنمائی میں ان میں بعض ترامیم کر کے، ان میں کیے جانے والے انحرافات کو ختم کر کے اور ان کی بدعات کی اصلاح کر کے انھیں اپنے ماننے والوں کے لیے جاری فرمایا۔

فاضل ناقد نے نماز اور حج کی مثال دی ہے اور لکھا ہے: ”دین ابراہیمی کی بنیادی عبادات نماز اور مناسک حج وغیرہ بھی محفوظ نہ تھیں چہ جائیکہ باقی اعمال محفوظ رہے ہوں۔“ ہمارے نزدیک ان سنن کے حوالے سے قرآن وحدیث میں ان کے بیان ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اعمال فی الجملہ محفوظ تھے اور اہل عرب ان پر عامل تھے۔

۱۔ سورہ ماعون کے الفاظ سے واضح ہے کہ مشرکین عرب میں اسلام سے پہلے بھی لوگ نماز پڑھتے تھے۔ ارشاد ہے:

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ. (۵-۱۰۷)

”اس لیے بربادی ہے (حرم کے پروہت) ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں (کی حقیقت سے) غافل ہیں۔“

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے تین سال پہلے ہی میں نماز پڑھتا تھا۔

پوچھا گیا کہ کس کے لیے؟ فرمایا: اللہ کے لیے۔ (مسلم، رقم ۶۳۵۹)

کلام عرب سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ نماز دین ابراہیم کی روایت کے طور پر رائج تھی۔ جاہلی شاعر جبران

العود کہتا ہے:

ثالثاً، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بنی اسماعیل میں دین ابراہیمی کی جو روایت رائج تھی، اس میں انھوں نے بعض تحریفات کر رکھی تھیں اور بعض بدعات اختراع کر لی تھیں، لیکن یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ان تحریفات اور بدعات کا تحریف اور بدعت ہونا پوری طرح مسلم تھا، یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بھی انھیں اختیار نہیں کیا۔ مزید برآں نبوت کے بعد ان تحریفات کی نشان دہی اور ان بدعات سے آگاہی کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی رہنمائی بھی میسر ہو گئی۔ اس تناظر میں بالبداہت واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو سنت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا تو اس میں کسی طرح کا کوئی ابہام نہیں تھا۔

رابعاً، فاضل ناقد کا اعتراض اگر حفاظت ہی کے پہلو سے ہے تو سوال یہ ہے کہ ”ملت ابراہیم“ کا جو مفہوم و مصداق خود انھوں نے متعین کیا ہے، یعنی توحید، شرک سے اجتناب اور اطاعت الہی، کیا یہ تصورات مشرکین عرب کے ہاں محفوظ اور تحریف و آمیزش سے پاک تھے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ فاضل ناقد اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ، بلاشبہ مشرکین نے ان تصورات میں تحریف و آمیزش کر رکھی تھی، لیکن وہ اس آمیزش سے بھی پوری طرح آگاہ تھے اور اصل تصورات کو بھی بخوبی جانتے تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ بعینہ یہی معاملہ اعمال کا بھی ہے۔ وہ ان اعمال کی اصل سے بھی واقف تھے اور ان کے محرفات کو بھی جانتے تھے۔

یہ نکات امید ہے کہ فاضل ناقد کے اطمینان کے لیے کافی ہوں گے۔ مزید تاکید کے لیے اہل علم کی تالیفات کے

وادرکن اعجازاً من اللیل بعد ما اقام الصلوۃ العابد المتحنف

”اور ان سوار یوں نے رات کے پچھلے حصے کو پالیا، جبکہ عبادت گزار حنفی نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔“

عشی وائل کا شعر ہے:

و سبھ علی حین العشیات والضحیٰ ولا تعبد الشیطان، واللہ فاعبدا

”اور صبح و شام تسبیح کرو، اور شیطان کی عبادت نہ کرو، بلکہ اللہ کی عبادت کرو۔“

۲ حج و عمرہ کے حوالے سے یہ بات پوری طرح مسلم ہے۔ اہل عرب نہ صرف اس کے مناسک اور رسوم و آداب سے آگاہ تھے، بلکہ ان بدعتوں کے بارے میں بھی پوری طرح متنبہ تھے جو انھوں نے اس کے مراسم میں شامل کر رکھی تھیں۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ایک حج کے موقع پر جبیر بن مطعم آپ کو میدان عرفات میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے تعجب ہوا کہ قریش کے لوگ تو مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وقوف عرفہ کے لیے یہاں حاضر ہیں۔ (بخاری، رقم ۱۶۶۴)

چند اقتباس درج ذیل ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تمام احکام جنہیں غامدی صاحب نے دین ابراہیمی کی روایت قرار دے کر سنن کی فہرست میں شمار کیا ہے، ہمارے جلیل القدر علما بھی انہیں دین ابراہیمی کی مستند روایت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے دین اسلام کے پس منظر کے حوالے سے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”حجتہ اللہ البالغہ“ میں بیان کیا ہے کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ تمام انبیاء نے بنیادی طور پر ایک ہی جیسے عقائد اور ایک ہی جیسے اعمال کی تعلیم دی ہے۔ شریعت کے احکام اور ان کی بجا آوری کے طریقوں میں حالات کی ضرورتوں کے لحاظ سے، البتہ کچھ فرق رہا ہے۔ سرزمین عرب میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس موقع پر اس دین کے احوال یہ تھے کہ صدیوں کے تعامل کے نتیجے میں اس کے احکام دینی مسلمات کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور ملت ابراہیم کے طور پر پوری طرح معلوم و معروف تھے، تاہم بعض احکام میں تحریفات اور بدعات داخل ہو گئی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا: اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا، یعنی ملت ابراہیم کی پیروی کرو۔ آپ نے یہ پیروی اس طریقے سے کی کہ اس ملت کے معلوم و معروف احکام کو برقرار رکھا، بدعات کا قلع قمع کیا اور تحریف شدہ احکام کو ان کی اصل صورت پر بحال فرمایا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

اصل الدین واحد اتفق علیہ الانبیاء
علیہم السلام، وانما الاختلاف فی
الشرائع والمناہج. تفصیل ذلك انه
اجمع الانبیاء علیہم السلام علی
توحید اللہ تعالیٰ عبادۃ واستعانة، ...
وانه قدر جميع الحوادث قبل ان
یخلقها، وان للہ ملائكة لا یعصونه
فیما امر، ویفعلون ما یؤمرون، وانه
ینزل الكتاب علی من یشاء من عبادہ،
ویفرض طاعته علی الناس، وان
القیامة حق، والبعث بعد الموت حق،
والجنة حق، والنار حق. و كذلك

”اصل دین ایک ہے، سب انبیاء علیہم السلام نے اسی
کی تبلیغ کی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو فقط شرائع اور
مناہج میں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سب انبیاء نے
متفق الکلمہ ہو کر یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید
دین کا بنیادی پتھر ہے۔ عبادت اور استعانت میں کسی
دوسری ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ ... ان کا
یہ پختہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے سب حوادث اور
واقعات کو وقوع سے پہلے ازل میں مقدر کیا ہوا ہے۔
اللہ تعالیٰ کی ایک پاک مخلوق ہے جس کو ملائکہ کہتے
ہیں۔ وہ کبھی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے اور
اس کے احکام کی اسی طرح تعمیل کرتے ہیں، جس طرح
ان کو حکم ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو

چن لیتا ہے جس پر وہ اپنا کلام نازل فرماتا ہے اور لوگوں پر اس کی اطاعت فرض کر دیتا ہے۔ موت کے بعد زندہ ہونا اور قیامت کا قائم ہونا حق ہے، جنت اور دوزخ کا ہونا حق ہے۔ جس طرح ہر دین کے عقائد ایک ہیں، اسی طرح بنیادی نیکیاں بھی ایک جیسی ہیں۔ چنانچہ دین میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ نوافل عبادات کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں قرب حاصل کرنے کی تعلیم ہر دین میں موجود ہے۔ مثلاً مرادوں کے پورا ہونے کے لیے دعا مانگنا، اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہنا نیز کتاب منزل کی تلاوت کرنا۔ اس بات پر بھی تمام انبیاء علیہم السلام کا اتفاق ہے کہ نکاح جائز اور سفاح حرام اور ناجائز ہے۔ جو حکومت دنیا میں قائم ہو عدل اور انصاف کی پابندی کرنا اور کمزوروں کو ان کے حقوق دلانا اس کا فرض ہے۔ اسی طرح یہ بھی اس کا فرض ہے کہ مظالم اور جرائم کے ارتکاب کرنے والوں پر حد نافذ کرے، دین اور اس کے احکام کی تبلیغ اور اشاعت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔ یہ دین کے وہ اصول ہیں جن پر تمام ادیان کا اتفاق ہے اور اس لیے تم دیکھو گے کہ قرآن مجید میں ان باتوں کو مسلمات مخاطبین کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کی لمیت سے بحث نہیں کی گئی۔ مختلف ادیان میں اگر اختلاف ہے تو وہ فقط ان احکام کی تفصیل اور جزئیات اور طریق ادا سے متعلق ہے۔“

اجمعوا علی انواع البر من الطهارة والصلوة والزکوة والصوم والحج والتقرب الی اللہ بنوافل الطاعات من الدعاء والذکر وتلاوة الكتاب المنزل من اللہ، وكذلك اجمعوا الی النکاح وتحريم السفاح واقامة العدل بین الناس وتحريم المظالم واقامة الحدود علی اهل المعاصی والجهاد مع اعداء اللہ والاجتهاد فی اشاعة امر اللہ ودينه، فهذا اصل الدين، ولذلك لم يبحث القرآن العظيم عن لمية هذه الاشياء الا ما شاء اللہ، فانها مسلمة فیمن نزل القرآن علی السنتهم. وانما الاختلاف فی صور هذه الامور واشباحها.

(حجۃ اللہ البالغہ ۱۹۹۱-۲۰۰۰)

۳ سفاح کا لفظ نکاح کے مقابل میں ہے، اس کے معنی ناجائز طریقے سے صنفی خواہش پوری کرنے کے ہیں۔

”ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا: اتَّبِعْ
مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا“ اور آپ کی امت کو ان الفاظ
سے مخاطب کیا گیا: مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ۔ اسی
طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فرمایا: وَإِنَّ
مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ۔ اس کا راز اور اس کی
حقیقت یہ ہے کہ جب کسی دین پر بہت صدیاں گزر
جاتی ہیں اور اس اثنا میں لوگ اس کی پابندی اور اس
کے شعائر کی تعظیم اور احترام میں مشغول رہتے ہیں تو
اس کے احکام اس قدر شائع و ذائع ہو جاتے ہیں کہ
ان کو بدیہات اور مشہورات مسلمہ سے تشبیہ دی جاسکتی
ہے اور کسی کو بھی ان سے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہوتی،
لیکن ساتھ ہی اس کے احکام میں طرح طرح کا تغیر و
تبدل اور اس کی تعلیمات میں مختلف النوع تحریفات
بھی آجاتی ہیں اور بعض بری رسوم بھی رواج پا جاتی
ہیں۔ چنانچہ ان رسوم کی اصلاح اور ان تحریفات کا قلع
تقع کرنے کے لیے ایک نبی کی ضرورت ہوتی ہے اور
جب وہ مبعوث ہو چکتا ہے تو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ
جو احکام اس قوم میں جس کی طرف وہ مبعوث ہوا ہے،
شائع و ذائع ہیں، ان پر وہ ایک نظر غائر ڈالتا ہے جو
احکام سیاست ملیہ کے اصول کے مطابق ہوتے ہیں،
ان کو برقرار رکھتا ہے اور لوگوں کو ان کے پابند رہنے کی
ترغیب دیتا اور تاکید کرتا ہے، برخلاف اس کے جن
میں تحریف آچکی ہے، ان کو بدل کر اپنی اصل صورت
پر لاتا ہے اور جن احکام میں ہنگامی مصلحت کے لحاظ
سے کچھ کمی بیشی کرنا مطلوب ہو، ان میں وقتی مصالح

واعلم أن النبوة كثيراً ما تكون من
تحت الملة كما قال الله تعالى: (مِلَّةَ
أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ) وكما قال: (وَإِنَّ مِنْ
شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ) وسر ذلك انه تنشأ
قرون كثيرة على التدين بدين. وعلى
تعظيم شعائره. وتصير احكامه من
المشهورات الذائعة اللاحقة بالبدیہیات
الاولیة التي لا تكاد تنكر. فتجئ نبوة
اخرى لاقامة ما اعوج منها؛ وصلاح
ما فسد منها بعد اختلاط رواية نبیہا،
فتفتش عن الاحكام المشهورة
عندهم، فما كان صحيحاً موافقاً
لقواعد السياسة الملية لا تغیره، بل
تدعو اليه، وتحث عليه، وما كان
سقيماً قد دخله التحريف، فانها تغیره
بقدر الحاجة، وما كان حرياً ان يزداد،
فانها تزيد على ما كان عندهم.

(حجة الله البالغة ۲۰۹/۱)

کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل کر دیتا ہے۔“

شاہ صاحب نے ملت ابراہیمی کے حوالے سے اسی بات کو ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت حنیفیہ فاعلم انه ^{صلی اللہ علیہ وسلم} بعث بالملة الحنیفیة الاسماعیلیة لاقامة عوجها وازالة تحریفها واشاعة نورها، وذلك قوله تعالى: (مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرٰهِيْمَ) ولما كان الامر على ذلك وجب ان تكون اصول تلك الملة مسلمة، وسنتها مقررة اذ النبى اذا بعث الى قوم فيهم بقية سنة راشدة، فلا معنى لتغيرها وتبديلها، بل الواجب تقريرها، لانه اطوع لنفوسهم واثبت عند الاحتجاج عليهم.

(حجة الله البالغة ۱/۲۲۷)

اس لیے یہ ضروری تھا کہ ملت ابراہیم کے اصول کو محفوظ رکھا جائے اور ان کی حیثیت مسلمات کی ہو۔ اسی طرح جو سنتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کی تھیں، ان میں اگر کوئی تغیر نہیں آیا تو ان کا اتباع کیا جائے۔ جب کوئی نبی کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس سے پہلے نبی کی شریعت کی سنت راشدہ ایک حد تک ان کے پاس محفوظ ہوتی ہے جس کو بدلنا غیر ضروری، بلکہ بے معنی ہوتا ہے۔ قرین مصلحت یہی ہے کہ اس کو واجب الاتباع قرار دیا جائے، کیونکہ جس سنت راشدہ کو وہ لوگ پہلے بنظر استحسان دیکھتے ہیں، اسی کی پابندی پر مامور کیا جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اس کو قبول کرنے میں ذرہ بھی پس و پیش نہیں کریں گے اور اگر کوئی اس سے انحراف یا سرتابی کرے تو اس کو زیادہ آسانی سے قائل کیا جاسکے گا، کیونکہ وہ خود اس کے مسلمات میں سے ہے۔“

یہ بات بھی اہل علم کے ہاں پوری طرح مسلم ہے کہ دین ابراہیمی کے سنن عربوں میں قبل از اسلام رائج تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ عرب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اعتکاف، قربانی، ختنہ، وضو، غسل، نکاح اور

تدیین کے احکام پر دین ابراہیمی کی حیثیت سے عمل پیرا تھے۔ ان احکام کے لیے شاہ صاحب نے 'سنة' (سنت)، 'سنن' متاکدہ (موکد سنتیں)، 'سنة الانبياء' (انبیاء کی سنت) اور شعائر الملة الحنیفیه (ملت ابراہیمی کے شعار) کی تعبیرات اختیار کی ہیں:

وكان من المعلوم عندهم ان كمال الانسان ان يسلم وجهه لربه، ويعبدہ اقصى مجهودہ. وان من ابواب العبادة الطهارة، وما زال الغسل من الجنابة سنة معموله عندهم، وكذلك الختان وسائر خصال الفطرة، وفي (التوراة) ان الله تعالى جعل الختان ميسمة على ابراهيم وذريته. وهذا الوضوء يفعله المجوس واليهود وغيرهم، وكانت تفعله حكماء العرب. وكانت فيهم الصلوة، وكان "ابو ذر" رضي الله عنه يصلي قبل ان يقدم على النبي ﷺ بثلاث سنين، وكان "قس بن ساعدة الايادي" يصلي، والمحفوظ من الصلوة في امم اليهود والمجوس وبقية العرب افعال تعظيمية لا سيما السجود واقوال من الدعاء والذكر. وكانت فيهم الزكاة،... وكان فيهم الصوم من الفجر الى غروب الشمس، وكانت قریش تصوم عاشوراء في الجاهلية. وكان الجوار في المسجد، وكان "عمر" نذر اعتكاف ليلة في الجاهلية، فاستفتي في ذلك رسول

"یہ بات وہ سب (عرب) جانتے تھے کہ انسان کا کمال اور اس کی سعادت اس میں ہے کہ وہ اپنا ظاہر اور باطن کلیۃ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اس کی عبادت میں اپنی انتہائی کوشش صرف کرے۔ طہارت کو وہ عبادت کا جز سمجھتے تھے اور جنابت سے غسل کرنا ان کا معمول تھا۔ ختنہ اور دیگر خصال فطرت کے وہ پابند تھے۔ تورات میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام اور اس کی اولاد کے لیے ختنہ کو ایک شناخت کی علامت مقرر کیا۔ یہودیوں اور مجوسیوں وغیرہ میں بھی وضو کرنے کا رواج تھا اور حکماء عرب بھی وضو اور نماز عمل میں لایا کرتے تھے۔ ابوذر غفاری اسلام میں داخل ہونے سے تین سال پہلے، جبکہ ابھی ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، نماز پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح قس بن ساعدہ ایادی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہود اور مجوس اور اہل عرب جس طریقے پر نماز پڑھتے تھے، اس کے متعلق اس قدر معلوم ہے کہ ان کی نماز افعال تعظیم پر مشتمل ہوتی تھی جس کا جزو اعظم سجود تھا۔ دعا اور ذکر بھی نماز کے اجزا تھے۔ نماز کے علاوہ دیگر احکام ملت بھی ان میں رائج تھے۔ مثلاً زکوٰۃ وغیرہ۔... صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور صنفي تعلق سے محتر ز رہنے

اللّٰهُ ﷺ،... واما حج بيت الله
وتعظيم شعائره والاشهر الحرم...
ولم تنزل سنتهم الذبح في الحلق
والنحر في اللبة ما كانوا يخنقون، ولا
يبيعون.... وكانت لهم سنن
متأكدة يتلاومون على تركها في
مأكلهم ومشربهم ولباسهم
وولائمهم واعیادهم ودفن موتاهم
ونكاحهم وطلاقهم وعدتهم
واحداهم، ويوعهم ومعاملاتهم،
وما زالوا يحرمون المحارم كالبنات
والامهات والاخوات وغيرها.
وكانت لهم مزاجرفی مظالمهم
كالقصاص والديات والقسمات
وعقوبات على الزنا والمبرقة.

(حجة الله البالغة ۱/ ۲۹۰-۲۹۲)

کو روزہ خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عہد جاہلیت میں
قریش عاشور کے دن روزہ رکھنے کے پابند تھے۔
اعتکاف کو بھی وہ عبادت سمجھتے تھے۔ حضرت عمر کا یہ قول
کتب حدیث میں منقول ہے کہ انھوں نے زمانہ جاہلیت
میں ایک دن کے لیے اعتکاف میں بیٹھنے کی منت مانی
تھی جس کا حکم انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے
دریافت کیا۔... اور یہ تو خاص و عام جانتے ہیں کہ
سال بہ سال بیت اللہ کے حج کے لیے دور دور سے
ہزاروں کی تعداد میں مختلف قبائل کے لوگ آتے
تھے۔ ذبح اور نحر کو بھی وہ ضروری سمجھتے تھے۔ جانور کا گلا
نہیں گھوٹ دیتے تھے یا اسے چیرتے پھاڑتے نہیں
تھے۔ اسی طرح اشہر الحرم کی حرمت ان کے ہاں مسلم
تھی۔... ان کے ہاں دین مذکور کی بعض ایسی موکد
سننیں ماثور تھیں جن کے ترک کرنے والے کو مستوجب
ملامت قرار دیا جاتا تھا۔ اس سے مراد کھانے پینے،
لباس، عید اور ولیمہ، نکاح اور طلاق، عدت اور احداد،
خرید و فروخت، مردوں کی تجہیز و تکفین وغیرہ کے متعلق
آداب اور احکام ہیں جو حضرت ابراہیم سے ماثور و منقول
تھے اور جن پر ان کی لائی ہوئی شریعت مشتمل تھی۔ ان
سب کی وہ پابندی کرتے تھے۔ ماں بہن اور دیگر محرمات
سے نکاح کرنا اسی طرح حرام سمجھتے تھے، جیسا کہ قرآن
کریم میں مذکور ہے۔ قصاص اور دیت اور قسامت
کے بارے میں بھی وہ ملت ابراہیمی کے احکام پر عامل
تھے۔ اور حرام کاری اور چوری کے لیے سزائیں مقرر
تھیں۔“

والذبح والنحر سنة الانبياء عليهم السلام توارثوهما وفيهما مصالح... منها انه صار ذلك احد شعائر الملة الحنيفية يعرف به الحنيفي من غيره فكان بمنزلة الختان وخصال الفطرة فلما بعث النبي صلى الله عليه وسلم مقيماً للملة الحنيفية وجب الحفاظ عليه. (حجة الله البالغة ۲/۳۱۹-۳۲۰)

”انبياء عليهم السلام کی سنت ذبح اور نحر ہے جو ان سے متوارث چلی آئی ہے۔ ذبح اور نحر دین حق کے شعائر میں سے ہے اور وہ حنیف اور غیر حنیف میں تمیز کرنے کا ذریعہ ہے، اس لیے یہ بھی اسی طرح کی ایک سنت ہے، جس طرح کہ ختنہ اور دیگر خصال فطرت ہیں اور جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خلعت نبوت سے سرفراز فرما کر دنیا میں ہدایت کے لیے بھیجا گیا تو آپ کے دین میں اس سنت ابراہیمی کو دین حنیفی کے شعار کے طور پر محفوظ رکھا گیا۔“

امام رازی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ عربوں میں حج اور ختنہ وغیرہ کو دین ابراہیمی ہی کی حیثیت حاصل تھی: ومعلوم انه عليه السلام اتى بشرائع مخصوصة، من حج البيت والختان وغيرهما،... و كان العرب تدين بهنذه الاشياء. (التفسير الكبير ۱۸/۴)

”اور یہ بات معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت خاص تھی، جیسے بیت اللہ کا حج اور ختنہ وغیرہ۔... عربوں نے ان چیزوں کو دین کی حیثیت سے اختیار کر رکھا تھا۔“

ختنہ کی سنت کے حوالے سے ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس کی روایت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک بلا انقطاع جاری رہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیمی کی تکمیل اور توثیق کے لیے مبعوث ہوئے:

قال الموجبون الختان علم الحنيفية وشعار الاسلام ورأس الفطرة وعنوان الملة.... وعليه استمر عمل الحنفاء من عهد امامهم ابراهيم الى عهد خاتم الانبياء فبعث بتكميل الحنيفية وتقريرها لا بتحويلها وتغييرها. (ابن القيم، مختصر تحفة المولود ۱۰۳-۱۰۴)

”ختنہ کو واجب کہنے والوں کا قول ہے کہ یہ دین ابراہیمی کی علامت، اسلام کا شعار، فطرت کی اصل اور ملت کا عنوان ہے۔... دین ابراہیمی کی اتباع کرنے والے اپنے امام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے لے کر خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ہمیشہ اسی پر کار بند رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیمی کی تکمیل اور توثیق کے لیے مبعوث فرمائے گئے نہ کہ اس میں تغیر و تبدل کرنے کے لیے۔“

قبل از اسلام تاریخ کے محقق ڈاکٹر جواد علی نے اپنی کتاب ”المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام“ میں کم و بیش ان تمام سنن کو دین ابراہیمی کے طور پر نقل کیا ہے جنہیں جناب جاوید احمد غامدی نے سنتوں کی فہرست میں جمع کیا ہے اور جو عربوں میں اسلام سے پہلے رائج تھیں۔ اس ضمن میں فاضل محقق نے نماز، روزہ، اعتکاف، حج و عمرہ، قربانی، جانوروں کا تذکیہ، ختنہ، مونچھیں پست رکھنا، زیر ناف کے بال کاٹنا، بغل کے بال صاف کرنا، بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا، ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی، استنجا، میت کا غسل، تجہیز و تکفین اور تدفین کے بارے میں واضح کیا ہے کہ یہ سنن دین ابراہیم کے طور پر رائج تھیں اور عرب بالخصوص قریش ان پر کاربند تھے۔ لکھتے ہیں:

وعامة ولد (معد) بن عدنان علی بعض
 دین ابراہیم، یحجون البیت و یقیمون
 المناسک، و یقرون الضیف و یعظمون
 الاشهر الحرم، و ینکرون الفواحش
 و التقاطع و التظالم، و یعاقبون علی
 الجرائم. فادخل فی الدین امورا نعدھا
 الیوم من الاعراف و قواعد الاخلاق و السلوک،
 وجعلھا من سنة ابراہیم، ای دین العرب
 القدیم قبل افساده بالتعبہ للاصنام.
 (۳۳۵/۶)

”بنو معد بن عدنان دین ابراہیمی کے بعض اجزا پر
 کارفرما تھے۔ وہ بیت اللہ کا حج کرتے تھے اور اس کے
 مناسک ادا کرتے تھے۔ مہمان نواز تھے، حرمت والے
 مہینوں کی تعظیم کرتے تھے۔ فواحش، قطع جمی اور ایک
 دوسرے کے ساتھ ظلم و زیادتی کو برا جانتے تھے۔ جرائم
 کی صورت میں سزا بھی دیتے تھے۔ یہی چیزیں ہیں
 جنہیں آج ہم رسم و رواج اور اخلاقی اصول و ضوابط
 میں شمار کرتے ہیں۔ یہی امور سنت ابراہیمی تھے، یعنی
 بت پرستی سے پہلے عربوں کا قدیم دین۔“

و یدکر اهل الاخبار ان قریشا کانت
 تصوم یوم عاشوراء... و ذکر ان
 رسول اللہ کان یصوم عاشوراء فی
 الجاهلیة. (۳۳۹/۶)

”روایتوں میں ہے کہ قریش یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے
 تھے۔... روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم بھی نبوت سے پہلے یہ روزہ رکھتے تھے۔“

وقد نسب الاعتکاف فی الکھوف
 وفی البراری وفی الجبال الی عدد من
 هؤلاء الحنفاء. فقد ذکر اهل الاخبار
 انھم کانوا قد اعتکفوا فی المواضع
 الحالیة البعیدة عن الناس، و حبسوا انفسھم

”اعتکاف کی نسبت دین ابراہیمی کے متبعین کی طرف
 کی جاتی ہے جو پہاڑوں، غاروں اور غیر آباد جگہوں میں
 اس کا اہتمام کرتے تھے۔ اہل اخبار بیان کرتے ہیں
 کہ وہ ویران اور آبادی سے دور مقامات پر اعتکاف کیا
 کرتے تھے۔ ان جگہوں میں وہ اپنے آپ کو بند رکھتے

اور شدید حاجت اور ضروری کام کے علاوہ باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان میں عبادت کرتے، کائنات میں غور و فکر کرتے، سچ اور حق کے لیے دعا کرتے۔“

”دین ابراہیمی کے پیرو نساک، یعنی عبادت گزاروں میں سے تھے۔ وہ قربانی کے جانور کو بھی ’نسک‘ میں شمار کرتے تھے اور وہ ”نسکھ“ سے مراد ”ذبیحہ“ لیتے تھے۔ قربانی کے جانور، یعنی نساک زمانہ جاہلیت کے لوگوں کے نزدیک زہد و عبادت کے اہم مظاہر میں سے تھے۔“

”بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مردوں پر صلوٰۃ پڑھتے تھے۔ ان کی نماز جنازہ یہ تھی کہ میت کو کھاٹ پر لٹا دیا جاتا، پھر اس کا ولی کھڑا ہوتا اور اس کے تمام محاسن بیان کرتا اور اس کی مدح و ثنا کرتا۔ پھر کہتا: تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ پھر اس کو دفن کر دیا جاتا۔“

”غسل جنابت اور مردوں کو نہلانا بھی ان سنتوں میں سے ہے جو اسلام میں مقرر کی گئیں۔ افوہ اودی کے شعر میں غسل میت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اعشیٰ اور بعض جاہلی شعرا کی طرف منسوب اشعار میں مردوں کے کفن اور ان پر نماز پڑھنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ روایتوں میں ہے کہ قریش اپنے مردوں کو غسل دیتے اور خوشبو لگاتے تھے۔“

”اہل اخبار بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متبعین کی کچھ ایسی علامات اور عادات

فیہا، فلا یخرجون منها الا لحاجة شديدة وضرورة ماسة. یتحشون فیہا ویتملون فی الکون، یلتمسون الصدق والحق. (۵۰۹/۶)

وقد کان الحنفاء من النساک ای المتعبدین. وعدوا الذبائح من النسک. وجعلوا النسیکة: الذبیحة. والذبائح، ای النساک، ہی من اہم مظاہر التعبد والزہد عند الجاہلیین. (۵۱۰/۶)

و ذکر انہم کانوا یصلون علی موتاہم، و کانت صلاتہم ان یحمل المیت علی سریر، ثم یقوم ولیہ، فیذکر محاسنہ کلہا ویشنی علیہ. ثم یقول: علیک رحمة اللہ. ثم یدفن. (۳۲۷/۶)

واما الاغتسال من الجنابة و تغسیل الموتی، فمن السنن التي اقرت فی الاسلام، وقد اشیر الی غسل المیت فی شعر للأفوہ الأودی. وأشیر الی تکفین الموتی والصلوة علیہم فی اشعار منسوبة الی الأعشی والی بعض الجاہلیین. وورد أن قریشاً کانت تغسل موتاہا وتحنطہم.

(۳۲۴/۶)

ویذکر اہل الاخبار انہ کان لاتباع ابراہیم من العرب علامات وعادات میزوا

انفسہم بہا عن غیرہم، منها: الختان،
 وحلق العانة، وقص الشارب...
 ومن سنن شریعة ابراہیم الاختتان.
 وهو من العادات القديمة الشائعة بین
 العرب الجاہلیین الوثنیین. (۵۰۸/۶)
 تھیں، جن کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز تھے۔ ان
 میں سے ختنہ، زیر ناف بال کاٹنا اور مونچھیں ترشوانا۔
 ... ختنہ شریعت ابراہیم کی سنتوں میں سے ایک سنت
 ہے۔ یہ ان قدیم عادات میں سے ہے جو مانہ جاہلیت
 کے بت پرستوں میں عام تھیں۔“

سیدنا ابراہیم سے سنن کا استناد

فاضل ناقد نے تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے سنن کی نسبت تو اتر عملی کے معیار پر تو کجا، خبر صحیح کے معیار پر بھی ثابت نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ اگر یہ ثابت ہی نہیں ہے کہ مذکورہ اعمال کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دین کی حیثیت سے جاری فرمایا تھا تو انھیں دین ابراہیمی کی روایت کی حیثیت سے پیش کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

”غامدی صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ کے نزدیک سنت وہ ہے جس کا منبع حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں۔ آپ نے جن ستائیس سنن کو بیان کیا ہے پہلے ان کو حضرت ابراہیم تک تو اتر عملی سے ثابت تو کریں۔ کیونکہ خود آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق سنت خبر سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ تو اتر عملی سے ثابت ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی شے کو اخذ کرنے کا ذریعہ یا تو براہ راست مشاہدہ ہے یا بالواسطہ مشاہدہ۔ یہ بات تو واضح ہے کہ غامدی صاحب نے اپنی بیان کردہ سنن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے براہ راست مشاہدہ نہیں کیا۔ رہی دوسری صورت یعنی بالواسطہ مشاہدہ تو اس کا ذریعہ خبر ہے۔ غامدی صاحب خبر سے ثابت کر دیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنن ہیں تو پھر ہم بھی مان لیں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غامدی صاحب خبر کے ذریعے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنی بیان کردہ سنن کی فہرست کی نسبت ثابت کرنے سے عاجز اور قاصر ہیں۔ غامدی صاحب نے یہ لکھ تو دیا ہے کہ سنت کا منبع و سرچشمہ حضرت ابراہیم ہیں اور سنت تو اتر عملی سے ثابت ہوتی، لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ حضرت ابراہیم کی طرف ان اعمال کی نسبت تو اتر عملی سے کیسے ثابت کریں گے؟ چلیں تو اتر عملی نہ سہی خبر صحیح سے ثابت کر دیں کہ ان اعمال کو حضرت ابراہیم نے بطور دین جاری کیا۔ جب تک غامدی صاحب اپنی بیان کردہ سنن کی فہرست کے بارے میں یہ ثابت نہ کر دیں کہ ان اعمال کو حضرت ابراہیم نے دین کی حیثیت جاری کیا، اس وقت تک اس بات کا کوئی جواز نہیں بنتا کہ وہ ان اعمال کو دین ابراہیمی کی روایت کے نام سے پیش کریں، کیونکہ یہ اعمال ان کی تعریف کے مطابق اسی وقت سنت بنیں گے جب ان کی نسبت حضرت ابراہیم سے صحیح ثابت

ہو جائے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی طرف ان اعمال کی نسبت صحیح ثابت کرنے کا واحد ذریعہ اب ان کے پاس خبر ہے اور خبر سے ان کے نزدیک سنت ثابت نہیں ہوتی بلکہ سنت تو ان کے نزدیک تو اتر عملی سے ثابت ہوتی ہے۔ غامدی صاحب کی بیان کردہ سنن کی نسبت حضرت ابراہیمؑ سے ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ جب کسی عمل کے بارے میں یہ ثابت کرنا ہی ممکن نہیں ہے کہ ان اعمال کو حضرت ابراہیمؑ نے بطور دین جاری کیا تو کسی عمل کے بارے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سنت ابراہیمی ہے! (فکر غامدی ۴۸-۴۹)

ہمارے نزدیک فاضل ناقد کا یہ اعتراض بالکل بے معنی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کے تصور کے مطابق سنت کی صورت میں موجود دین کا ماخذ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ اگر سیدنا ابراہیمؑ کی ذات کو ماخذ قرار دیتے تو اسی صورت میں فاضل ناقد کا اعتراض لائق اعتنا ہوتا، لیکن ان کی کسی تحریر میں بھی اس طرح کا تاثر نہیں ہے۔ ”اصول و مبادی“ میں انھوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بات بیان کی ہے کہ رہتی دنیا تک کے لیے دین کا ایک ہی ماخذ ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ انھی سے یہ دین قرآن اور سنت کی دو صورتوں میں ملا ہے۔ سنت اگرچہ اپنی نسبت اور تاریخی روایت کے لحاظ سے سیدنا ابراہیمؑ ہی سے منسوب ہے، لیکن اس روایت کو ہمارے لیے دین کی حیثیت اس بنا پر حاصل ہوئی ہے کہ اسے نبی آخر الزماں نے دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔

سنن کی سیدنا ابراہیمؑ سے نسبت

فاضل ناقد نے چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ غامدی صاحب کی مرتب کردہ سنن کی فہرست میں سے بیش تر سنن ایسی ہیں جن پر عمل کے شواہد ابراہیم علیہ السلام سے پہلے انبیاء کے ہاں بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس کی مثال قربانی اور تدفین ہے۔ چنانچہ حقیقت اگر یہی ہے تو غامدی صاحب کے اصول کی رو سے انھیں سنت ابراہیمی کے طور پر نہیں، بلکہ سنت آدم یا سنت نوح کے طور پر پیش کیا جانا چاہیے۔ لکھتے ہیں:

”غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنت کی تعریف میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کیا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ تاریخی حقیقت تو یہ کہتی ہے کہ غامدی صاحب کو سنت کی تعریف میں حضرت ابراہیمؑ کی بجائے حضرت آدمؑ کا نام شامل کرنا چاہیے۔ غامدی صاحب کی بیان کردہ اکثر و بیشتر سنن وہ ہیں جو کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ مثلاً غامدی صاحب کی بیان کردہ دو سنن قربانی اور تدفین کو ہی لے لیں۔ ان سنن کی تاریخ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہم ان کی نسبت

حضرت آدم کی طرف کریں، قرآن کے مطابق قربانی اور تدفین کی سنن کی ابتدا حضرت آدم کے زمانے ہی سے ہو گئی تھی۔۔۔

ان آیات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قربانی اور تدفین سنت ابراہیمی نہیں، بلکہ سنت آدم ہیں۔ اسی طرح نکاح و طلاق، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب، حیض و نفاس کے بعد غسل، غسل جنابت اور اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ کرنے کو سنت ابراہیم کہنے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ معاذ اللہ حضرت ابراہیم سے پہلے انبیاء میں زن و شو کے تعلقات کے لیے نکاح و طلاق کا کوئی تصور نہ تھا، حیض و نفاس کی حالت میں انبیاء اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے اور مباشرت کے بعد غسل کا بھی کوئی حکم ان کی شریعت میں موجود نہ تھا! حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے گزر جانے والے انبیاء کی امتوں میں جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیا جاتا تھا اور نہ ہی حیض و نفاس کے بعد عورتیں غسل کرتی تھیں۔ مزید برآں پچھلے انبیاء میں نہ نماز تھی نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ۔ اگر یہ سب کچھ پچھلے انبیاء کی شریعتوں میں نہیں تھا تو پھر ان کی شریعت کیا تھی؟ جس کے بارے میں قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے۔۔۔

ہماری اس تنقیح پر اگر غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ ان احکامات کے بارے میں ہمارا بھی نقطہ نظر یہی ہے کہ یہ احکامات حضرت ابراہیم سے ما قبل شریعتوں میں بھی موجود تھے تو پھر غامدی صاحب کی یہ بیان کردہ سنن، سنن ابراہیمی نہ رہیں گی بلکہ سنن آدم ہوں گی۔ غامدی صاحب کو چاہیے جس عمل کی ابتدا جس نبی سے پہلی مرتبہ ثابت ہو رہی ہے، اس عمل کی نسبت اسی نبی کی طرف کریں اور اس کو اسی نبی کی سنت کے نام سے پیش کریں، پھر دیکھیں کہ حضرت ابراہیم کے حوالے سے جو انہوں نے سنن بیان کی ہیں ان میں سے کتنی ایسی ہیں جو کہ ان کی تعریف سنت کا صحیح مصداق بنتی ہیں۔“ (فکر غامدی ۵۰-۵۲)

فاضل ناقد کا یہ اعتراض بھی درست نہیں ہے۔ زبان و بیان کے مسلمات اور تاریخ و سیر کے معروفات کی رو سے یہ لازم نہیں ہے کہ کسی چیز کی نسبت اس کے اصل موجد ہی کی طرف کی جائے۔ بعض اوقات یہ نسبت بعد کے زمانے کی کسی مشہور و معروف شخصیت یا قوم کی طرف بھی کر دی جاتی ہے۔ سورہ مائدہ میں قصاص کے قانون کے لیے کُتِبْنَا عَلٰی بَنِي إِسْرَآءِیلَ (۳۲-ہم نے بنی اسرائیل پر فرض کیا تھا) کے الفاظ آئے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ قانون بنی اسرائیل سے پہلے بھی موجود تھا۔ قرآن نے اگر اسے بنی اسرائیل کے حوالے سے بیان کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ اس کا اجرا بھی بنی اسرائیل کے زمانے میں ہوا ہے۔ چنانچہ ابن العربی نے ”احکام القرآن“ میں بیان کیا ہے:

ولم یخل زمان آدم ولا زمن من بعده ”حضرت آدم اور ان کے بعد کوئی دور ایسا نہیں گزرا

من شرع. واهم قواعد الشرائع حماية
الدماء عن الاعتداء وحياطته بالقصاص
كفًا وردعًا للظالمين والجائرين، وهذا
من القواعد التي لا تخلو عنها الشرائع،
والاصول التي لا تختلف فيها الملل؛
وانما خص الله بنى اسرائيل بالذكر
للكتاب فيه عليهم؛ لانه ما كان ينزل
قبل ذلك من الملل والشرائع كان قولاً
مطلقاً غير مكتوب. (۵۹۱/۲)

کہ اس میں (اللہ کی) شریعت موجود نہ رہی ہو۔
شریعت کے قواعد میں سب سے اہم قاعدہ یہ ہے کہ ظلم
سے خون بہنے سے بچایا جائے اور قصاص کے ذریعہ
اس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے تاکہ ظالموں اور
جور کرنے والوں کے ہاتھ کوروکا اور پابند کیا جائے۔
یہ ان قواعد میں سے ہے جو ہر شریعت اپنے اندر رکھتی ہے
اور یہ اس اصول کا حصہ ہے جو تمام ملتیں بالاتفاق مانتی
ہیں۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر بنی اسرائیل
میں یہ قانون جاری فرمانے کا ذکر کیا، کیونکہ ان سے
پہلے کی امتوں کی طرف ان کی شریعتوں میں جو بھی
وحی نازل کی گئی، وہ محض قول ہوتا تھا اور لکھا ہوا نہ ہوتا
تھا۔“

فاضل ناقد کا وضع کردہ یہ اصول کہ کسی چیز کی نسبت لازماً اس کے اصل موجب ہی کی طرف ہونی چاہیے، اس قدر
خلاف حقیقت ہے کہ خود لفظ ملت پر، جس کے مفہوم و مصداق کی تعیین کے لیے فاضل ناقد نے یہ اصول تشکیل دیا ہے،
اس کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ فاضل ناقد نے لکھا ہے: ”ملت ابراہیم“ سے مراد دین اسلام کی وہ اساسی تعلیمات ہیں
جو کہ حضرت ابراہیم کی شخصیت میں نمایاں تھیں یعنی ہر قسم کے شرک سے اجتناب کرنا اور اللہ کا انتہائی درجے میں
فرمانبردار ہو جانا۔“ سوال یہ ہے کہ ملت ابراہیم کو فاضل ناقد شرک سے اجتناب اور اللہ کی فرماں برداری کے جس
مفہوم میں لے رہے ہیں، کیا یہ تصور اور یہ رویہ آپ سے پہلے انبیاء کے ہاں نہیں تھا؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے
اور یقیناً ایسا ہی ہے تو پھر فاضل ناقد نے اس کی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کیوں کی ہے؟

سنت کے ثبوت کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف پر اعتراضات کا جائزہ
سنت کے ثبوت کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف پر فاضل ناقد نے بنیادی طور پر چار اعتراض کیے
ہیں: ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ غامدی صاحب معیار ثبوت میں فرق کی بنا پر حکم کی نوعیت اور اہمیت میں فرق کو تسلیم
کرتے ہیں، جبکہ ذریعے کی بنیاد پر کسی چیز کے دین ہونے یا نہ ہونے میں فرق کرنا درست نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض

یہ کیا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک سنت کے ثبوت کا معیار اخبار آحاد نہیں، بلکہ تواتر عملی ہے، حالاں کہ تواتر کا ثبوت بذات خود اخبار آحاد کا محتاج ہے۔ تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ غامدی صاحب نے سنت کی تعیین کے جو اصول قائم کیے ہیں، بعض اطلاقات میں خود ان کی خلاف ورزی کی ہے۔ چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ غامدی صاحب کا سنت کی اصطلاح کو امت میں رائج مفہوم و مصداق سے مختلف مفہوم و مصداق کے طور پر بیان کرنا درست نہیں ہے۔ ان اعتراضات کی تفصیل اور ان پر ہمارا تبصرہ درج ذیل ہے۔

معیار ثبوت کی بنا پر فرق

فاضل ناقد نے بیان کیا ہے کہ غامدی صاحب معیار ثبوت میں فرق کی بنا پر حکم کی نوعیت اور اہمیت میں فرق کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ تواتر کے ذریعے سے ملنے والے احکام کو ایک درجہ دیتے ہیں اور آحاد کے ذریعے سے ملنے والے احکام کو دوسرا درجہ دیتے ہیں۔ یہ تفریق درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تواتر، دین کے نقل کا ذریعہ ہے اور ذریعے کی بنیاد پر کسی چیز کے دین ہونے یا نہ ہونے میں فرق کرنا درست نہیں ہے۔ صحابہ کرام کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والا ہر حکم دین تھا۔ بعد میں کسی حکم کو لوگوں نے تواتر سے نقل کیا اور کسی کو اخبار آحاد سے۔ ذریعے کو فیصلہ کن حیثیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسے شارع پر مقدم مان لیا جائے۔ بالفاظ دیگر غامدی صاحب نے تواتر کی شرط عائد کر کے لوگوں کو دین کے شارع کی حیثیت دے دی ہے۔ لکھتے ہیں:

”غامدی صاحب کے نزدیک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عمل جو کہ تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہو، سنت ہے، اور سنت دین ہے، گویا کہ ان کے نزدیک تواتر عملی سے ایک عمل دین بن جاتا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دوسرا عمل جو تواتر عملی سے منقول نہ ہو بلکہ خبر واحد سے مروی ہو، وہ دین نہیں ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل کے دین بننے میں اصل حیثیت تواتر عملی کی ہے۔ گویا یہ تواتر عملی ہی ہے جو کہ آپ کے کسی عمل کو دین بنا دیتا ہے اور کسی دوسرے عمل کو دین نہیں بناتا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب آپ کے کسی عمل کے دین بننے کے لیے اصل معیار تواتر عملی ٹھہرا تو معاذ اللہ تواتر عملی کی حیثیت آپ سے بڑھ کر ہو گئی جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اعمال کو دین بنا دیتا ہے اور بعض کو دین نہیں بناتا، نتیجتاً اصل شارع تو لوگ ہوئے، نہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جس عمل کو لوگوں نے تواتر سے نقل کر دیا وہ دین بن گیا اور جس عمل کو تواتر سے نقل نہ کیا وہ دین نہ بن سکا، یعنی اصل حیثیت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کی نہیں ہے بلکہ اصل حیثیت لوگوں کے آپ کے اعمال پر عمل کی ہے۔ آپ کے جس عمل

پر لوگوں نے تو اتر سے عمل کیا ہے، وہ دین ہے اور جس پر تو اتر سے عمل نہیں کیا، وہ دین نہیں ہے۔۔۔

دین اور چیز ہے اور اس کو آگے نقل کرنے کے ذرائع اور چیز ہیں۔ دونوں میں فرق ہے۔ دین کو روایت اور نقل کرنے کے ذرائع نہ تو دین ہیں اور نہ ان کو کسی چیز کے دین قرار دینے کے لیے معیار بنایا جاسکتا ہے۔ تو اتر عملی دین کو پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے نہ کہ کسی چیز کے دین بننے کا معیار۔ اگر غامدی صاحب کا یہ نقطہ نظر مان لیا جائے کہ تو اتر عملی سے ایک چیز دین بن جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ صحابہ کے لیے دین اور تھا اور ہمارے لیے دین اور ہے کیونکہ غامدی صاحب کے بقول ہمارے لیے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اعمال دین قرار پائیں گے جو کہ تو اتر عملی سے نقل ہوئے ہوں جبکہ صحابہ کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل دین ہوگا کیونکہ وہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کا براہ راست مشاہدہ کر رہے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمل جو کہ خبر واحد سے ثابت ہے غامدی صاحب کے نزدیک وہ ہمارے لیے دین نہیں ہے کیونکہ وہ تو اتر عملی سے ثابت نہیں ہے، تو کیا وہ عمل صحابہ کے لیے بھی دین نہیں ہوگا جو کہ دیکھتی آنکھوں اس کا مشاہدہ کر رہے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ تو اتر عملی کسی چیز کو دین ٹھہرانے کا کوئی معیار نہیں ہے۔ دین وہ ہے جسے اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم دین قرار دیں، چاہے وہ خبر واحد سے ہمیں ملے یا قوی تو اتر سے یا عملی تو اتر سے۔ ذریعے سے کوئی چیز دین نہیں بنتی، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے دین بنانے سے ایک چیز دین بنتی ہے اور بعد میں کسی ذریعے سے ہم تک پہنچتی ہے۔ یعنی دین پہلے موجود ہے پھر ذریعہ ہے جس سے وہ ہم تک پہنچا ہے۔ جبکہ غامدی صاحب کے بقول ذریعہ پہلے ہے اور دین بعد میں ہے اور ذریعے نے ہی ایک چیز کو دین بنانا ہے اور ایک چیز کو دین سے خارج کرنا ہے۔“

(فکر غامدی ۵۹-۶۰)

فاضل ناقد کی اس تقریر سے نہ صرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تو اتر عملی کے حوالے سے غامدی صاحب کی بات کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، بلکہ یہ تاثر بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ تقریر ان مسلمات سے صرف نظر کرتے ہوئے کی ہے جو انتقال علم کے ذرائع کے بارے میں بدیہیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غامدی صاحب کے نزدیک اجماع و تو اتر کی شرط کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فریضہ منصبی کے لحاظ سے اس پر مامور تھے کہ وہ اللہ کا دین پورے اہتمام، پوری حفاظت اور پوری قطعیت کے ساتھ اور بے کم و کاست لوگوں تک پہنچائیں۔ علمائے امت بھی اس امر پر متفق ہیں کہ دین کو مکمل اور بغیر کسی کمی یا زیادتی کے انسانوں تک پہنچانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی منصبی ذمہ داری تھی۔

امام سرہسی نے بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے اس پر مامور تھے کہ لوگوں کے لیے دین کے

احکام کو واضح کریں:

ان صاحب الشرع کان ماموراً بان ”شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس بات کا حکم دیا گیا
 یبین للناس ما یتحتاجون الیہ۔
 تھا کہ لوگوں کے لیے حاجت طلب احکام کو واضح
 (اصول السرخسی ۳۷۸/۱) فرمائیں۔“

شاہ ولی اللہ نے ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں بعثت انبیاء کی ضرورت کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ نبی کی لازمی ذمہ داری
 ہے کہ خدا کے جس پیغام کو وہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے مامور ہوا ہے، اسے وہ بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا
 دے۔ اس ضمن میں اس کی طرف سے کوئی کمی یا کوتاہی نہیں ہونی چاہیے:

ثم لا بد لهذا العالم ان یتثبت علی ”پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جو فرد کامل اس عظیم الشان
 رؤوس الاشهاد انه عالم بالسنة مقصد کو انجام دینے کے لیے چنا گیا ہے، وہ کھلے طور
 الراشدة، وانه معصوم فیما یقولہ من پر تمام لوگوں کے سامنے کسی طرح یہ ثابت کر دے کہ
 الخطأ والاضلال، ومن ان یدرک در حقیقت یہ وہی جلیل القدر ہستی ہے جس کو اللہ تعالیٰ
 حصۃ من الاصلاح، ویتروک حصۃ نے اس منصب کے لیے چن لیا ہے اور سب لوگ
 اخری لا بد منها۔ (۱۹۱/۱) یقین کر لیں کہ اس کو باری تعالیٰ نے سنت راشدہ کا
 پورا علم عنایت فرمایا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغاموں کو
 پہنچانے میں شیطان کے تصرف اور دراندازی سے
 محفوظ ہے۔ (اس کا کلام وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی
 اِنْ هُوَ اِلَّا وَحٰی یُّوْحٰی‘ کا زندہ ثبوت ہے اور وہ
 خداے پاک کی نازل کردہ ہدایات کو مکمل طور پر لوگوں
 تک پہنچاتا ہے) یا بالفاظ دیگر اس کے یہ معنی ہیں کہ
 تبلیغ میں وہ کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا کہ حق تعالیٰ کی
 بتائی ہوئی بعض باتیں ان کو پہنچا دے اور بعض کو چھپائے
 رکھے۔“

شاہ صاحب نے مزید بیان کیا ہے کہ نبی کا فریضہ نہ صرف دین کو بے کم و کاست اور پوری طرح پہنچانا ہے، بلکہ
 ان کے حقوق و فرائض کی اس حد تک تعیین کر دینا بھی ہے کہ اس کے نتیجے میں اعمال کے حدود اور ان کی کم سے کم

مقداروں کے تعین میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ ان کے نزدیک یہ تعین پیغمبر کا منصبی فریضہ ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ خلاف شریعت ہے:

”جب کوئی نبی اپنی امت کی سیاست دینیہ میں مشغول ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ان کے لیے فرائض اور حقوق کی تعین کرنے پر متوجہ ہوتا ہے تو ہر ایک طاعت کے لیے اعلیٰ اور ادنیٰ دو قسم کے حدود متعین کرتا ہے۔ ”اعلیٰ“ سے مراد کسی طاعت کی وہ مقدار ہے جس سے اس طاعت کا مقصد کامل ترین وجہ پر حاصل ہو جائے۔ برخلاف اس کے ”ادنیٰ“ طاعت مذکورہ کی کم از کم مقدار ہے جو فی الحکمہ مقصد اور غایت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، لیکن اس میں مزید کمی کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ حدود اور مقادیر وہ اس لیے معین کرتا ہے کہ یہ ہرگز اس کے منصب نبوت کے شایان شان نہیں ہے کہ جن اعمال کی بجا آوری کا وہ اپنی امت سے مطالبہ کرتا ہے یا ان کی بجا آوری کی ترغیب و تحریص دلاتا ہے، ان کے حدود کی تعین نہ کرے اور نہ ہی ان کا طریق ادا اور ان کے اجزاء اور کان ان کو بتائے اگر وہ بالفرض ایسا کرے تو یہ موضوع شریعت کے خلاف ہوگا۔“

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اہل علم کے نزدیک یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین کو بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ امت کو پہنچانے کے مکلف تھے۔ یہی مقدمہ ہے جس کی بنا پر اکابر اہل علم کے ہاں دو باتیں اصولی طور پر ہمیشہ مسلم رہی ہیں:

ایک کہ یہ دین کا اصل اور بنیادی حصہ، جس کا جاننا اور جس پر عمل پیرا ہونا تمام امت کے لیے واجب ہے، تو اتر اور تعامل ہی سے نقل ہوا ہے۔ چنانچہ کوئی ایسی چیز جو اس سے کم تر معیار پر ثابت ہو، اسے اصل دین کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

دوسری یہ کہ اخبار آحاد میں مجمع علیہ سنت کے فروع اور جزئیات ہی ہو سکتے ہیں جن کے ثبوت میں بھی بحث ہو سکتی ہے، بلکہ فقہاء کے مابین بکثرت ہوئی ہے، اور جن کا جاننا ہر مسلمان کے لیے لازم بھی نہیں ہے۔
ان دو مسلمات کے حوالے سے جلیل القدر علما کی آراء درج ذیل ہیں۔

۱۔ اصل دین کا اجماع اور تواتر سے منتقل ہونا

امام شافعی نے اجماع و تواتر سے ملنے والے دین کو ”علم عامہ“ اور ”اخبار العامة“ سے تعبیر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ دین کا وہ حصہ ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عامۃ المسلمین نے نسل در نسل منتقل کیا ہے۔ ہر شخص اس سے واقف ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت کے بارے میں تمام مسلمان متفق ہیں۔ یہ قطعی ہے اور درجہ یقین کو پہنچا ہوا ہے۔ نہ اس کے نقل کرنے میں غلطی کا کوئی امکان ہو سکتا ہے اور نہ اس کی تاویل و تفسیر میں کوئی غلط چیز داخل کی جاسکتی ہے۔ یہی دین ہے جس کی اتباع کے تمام لوگ مکلف ہیں:

قال الشافعی: فقال لی قائل: ما العلم؟
وما یجب علی الناس فی العلم؟ فقلت
له: العلم علمان: علم علما لا یسع بالغا
غیر مغلوب علی عقله جہلہ۔ قال: ومثل
ماذا؟ قلت: مثل الصلوات الخمس،
وان لله علی الناس صوم شهر رمضان،
وحج البيت اذا استطاعوه، وزكاة فی
اموالهم، وانه حرم علیهم الزنا والقتل
والسرقة والخمر، وما کان فی معنی
هذا، مما کلف العباد ان یعقلوه ویمعلوه
ويعطوه من انفسهم واموالهم، وان
یکفوا عنه: ما حرم علیهم منه. وهذا
الصنف کله من العلم موجود نصا فی
کتاب الله، وموجودا عاما عند اهل

امام شافعی کہتے ہیں: سائل نے مجھ سے سوال کیا
کہ علم (دین) کیا ہے اور اس علم (دین) کے بارے
میں لوگوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ میں نے
اسے جواب دیا کہ علم کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم علم عام
ہے۔ اس علم سے کوئی عاقل، کوئی بالغ بے خبر نہیں رہ
سکتا۔ اس علم کی مثال پنج وقتہ نماز ہے۔ اسی طرح اس
کی مثال رمضان کے روزے، اصحاب استطاعت پر
بیت اللہ کے حج کی فرضیت اور اپنے اموال میں سے
زکوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ زنا، قتل، چوری اور نشے کی
حرمت بھی اسی کی مثال ہے۔ ان چیزوں کے بارے
میں لوگوں کو اس بات کا مکلف بنایا گیا ہے کہ وہ جو
جاننے کی چیزیں ہیں، ان سے آگاہ ہوں، جن چیزوں
پر عمل مقصود ہے، ان پر عمل کریں، جنہیں ادا کرنا پیش نظر
ہے، ان میں اپنے جان و مال میں سے ادا کریں اور

الاسلام، ينقله عوامهم عن من مضى
من عوامهم، يحكونه عن رسول الله،
ولا يتنازعون في حكايته ولا وجوبه
عليهم. وهذا العلم العام الذي لا يمكن
فيه الغلط من الخبر، ولا التأويل، ولا
يجوز فيه التنازع. (الرساله ۳۵۷-۳۵۹)

جو حرام ہیں، ان سے اجتناب کریں۔ اس نوعیت کی
چیزوں کا علم کتاب اللہ میں منصوص ہے اور مسلمانوں
کے عوام میں شائع و ذائع ہے۔ علم کی یہ وہ قسم ہے جسے
ایک نسل کے لوگ گذشتہ نسل کے لوگوں سے حاصل
کرتے اور اگلی نسل کو منتقل کرتے ہیں۔ مسلمان امت
اس سارے عمل کی نسبت (بالاتفاق) رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف کرتی ہے۔ اس کی روایت میں،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت میں اور
اس کے لزوم میں مسلمانوں کے مابین کبھی کوئی اختلاف
نہیں رہا۔ یہ علم تمام مسلمانوں کی مشترک میراث ہے۔
نہ اس کے نقل میں غلطی کا کوئی امکان ہوتا ہے اور نہ
اس کی تاویل اور تفسیر میں غلط بات داخل ہو سکتی ہے۔
چنانچہ اس میں اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش باقی
نہیں رہتی۔“

ابن عبدالبر نے اجماع اور تواتر سے ملنے والی سنت کو نقل الکافۃ عن الکافۃ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور
اسے درجہ یقین پر ثابت تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے اس کے انکار کو اللہ کے نصوص کے انکار کے مترادف قرار دیا ہے۔
چنانچہ ان کے نزدیک اس کا مرتکب اگر توبہ نہ کرے تو اس کا قتل جائز ہے:

تنقسم السنة قسمين احدهما اجماع
تنقله الكافة عن الكافة، فهذا من الحجج
القاطعة للأعداء اذا لم يوجد هنالك
خلاف، ومن رد اجماعهم فقد رد نصاً
من نصوص الله يجب استتابته عليه
واراقة دمه ان لم يتب لخروجه عما
اجمع عليه المسلمون وسلو كه غير سبيل

”سنت کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جسے تمام
لوگ نسل در نسل آگے منتقل کرتے ہیں۔ اس طریقے
سے منتقل ہونے والی چیز کی حیثیت جس میں کوئی
اختلاف نہ ہو، قاطع عذر حجت کی ہے۔ چنانچہ جو شخص
ان (ناقلین) کے اجماع کو تسلیم نہیں کرتا، وہ اللہ کے
نصوص میں سے ایک نص کا انکار کرتا ہے۔ ایسے شخص
پر توبہ کرنا لازم ہے اور اگر وہ توبہ نہیں کرتا تو اس کا خون

جميعهم. والضرب الثاني من السنة
خبر الآحاد الثقات الأثبات المتصل
الاسناد. (جامع بيان العلم وفضله ۴۱۲-۴۲)
جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عادل مسلمانوں
کے اجماعی موقف سے انحراف کیا ہے اور ان کے
اجماعی طریقے سے الگ راہ اختیار کی ہے۔ سنت کی
دوسری قسم وہ ہے جسے ”آحاد راویوں“ میں سے ثابت،
ثقة اور عادل لوگ منتقل کرتے ہیں اور جس کی روایت
میں اتصال پایا جاتا ہے۔“

امام سرحسی نے عمومی معاملات میں کسی چیز کے مشروع ہونے کے لیے اس کے مشہور اور معلوم و معروف ہونے کو
ضروری قرار دیا ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے اس پر مامور تھے کہ لوگوں کے
لیے دین کے احکام کو واضح کریں۔ آپ نے اپنے صحابہ کو انھیں اگلی نسلوں کو منتقل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اگر ان میں
سے کوئی چیز کثرت اور شہرت کے ساتھ منتقل نہیں ہوئی، بلکہ خبر واحد کے طریقے پر منتقل ہوئی ہے تو اس کے معنی یہ
ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام امت کے لیے اسے مشروع نہیں کیا۔ لکھتے ہیں:

ان صاحب الشرع کان ماموراً بان یبین
للناس ما یحتاجون الیہ وقد امرهم بان
ینقلوا عنه ما یحتاج الیہ من بعدهم.
فاذا كانت الحادثة مما تعم به البلوی
فاظاہر ان صاحب الشرع لم یتروک بیان
ذلك للكفاة وتعلیمهم وانهم لم یتروکوا
نقله علی وجه الاستفاضة فحین لم یشتر
النقل عنهم عرفنا انه سهو او منسوخ
الاتری ان المتأخرین لما نقلوه اشتہر
فیہم فلو کان ثابتاً فی المتقدمین لاشتہر
ایضاً وما تفرد بنقله مع حاجة العامة
الی معرفته. (اصول السرخسی ۱/۳۷۸)

”شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس بات کا حکم دیا گیا
تھا کہ لوگوں کے لیے حاجت طلب احکام کو واضح
فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے انھیں حکم فرمایا کہ بعد میں
آنے والوں کے لیے ان ضروری مسائل کو منتقل کریں۔
اگر کوئی ایسا معاملہ ہوتا کہ تمام لوگ اس میں مبتلا
ہوتے تو، ظاہر ہے کہ، شارع (علیہ السلام) نے تمام
لوگوں کے لیے اس کے بیان اور تعلیم کو نہیں چھوڑا
ہے۔ اور انھوں نے آپ سے استفادہ کے بعد اس کو
نقل کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ اگر ان کی طرف یہ روایت
مشہور نہیں ہوئی تو ہمیں معلوم ہے کہ یہ سہو ہے یا حکم
منسوخ ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جب متأخرین نے
اس حکم کو نقل کیا ہے تو ان کے درمیان یہ مشہور ہو گیا۔
اگر متقدمین میں بھی یہ ثابت ہوتا تو مشہور ہو جاتا۔

اور باوجود اس کے کہ عامۃ الناس کو اس کی معرفت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس کو منفرد (تنہا) ہو کر روایت نہ کرتے۔“

علامہ آمدی نے قرآن مجید کے خبر واحد سے ثابت ہونے کو اسی بنا پر ممتنع قرار دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واجب تھا کہ آپ اسے قطعی ذریعے یعنی تواتر سے لوگوں تک پہنچائیں۔ نماز اور نکاح و طلاق جیسے مسائل جنہیں آپ لوگوں تک قطعی طور پر پہنچانے کے مکلف تھے، انہیں بھی آپ نے خبر واحد کے ذریعے سے نہیں، بلکہ تواتر ہی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچایا۔ ”الاحکام فی اصول الاحکام“ میں لکھتے ہیں:

واما القرآن فانما امتنع اثباته بخبر الواحد، لا لانه مما عم به البلوی، بل لانه المعجز فی اثبات نبوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وطریق معرفته متوقف علی القطع. ولذلك وجب علی النبی اشاعته والقائه علی عدد التواتر... وما عدا القرآن مما اشيع اشاعة اشترك فيها الخاص والعام، كالعبادات الخمس، واصول المعاملات كالبيع والنكاح والطلاق والعنق، وغير ذلك من الاحكام مما كان يجوز ان لا يشيع؛ فذلك اما بحکم الاتفاق، واما لانه صلی اللہ علیہ وسلم كان متعبداً باشاعته. (۱۶۴/۲)

”جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو اس کا اثبات خبر واحد کے ذریعے سے ممتنع ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ عموم بلوی مسائل میں سے ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات میں معجز ہے اور اس کی معرفت کا طریق دلیل قطعی پر موقوف ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی اشاعت اور حد تواتر تک لوگوں تک پہنچانا واجب تھا۔... قرآن مجید کے علاوہ جن چیزوں کی اشاعت ہوئی اور جن میں خاص و عام سب شریک ہیں، ان میں عبادت پنجگانہ، بیع، نکاح، طلاق اور عتاق جیسے معاملات کے اصول و قواعد شامل ہیں۔ ان کے علاوہ وہ احکام بھی ان میں شامل ہیں جن کی اشاعت نہ کرنا جائز ہے۔ ان کا اثبات یا اجماعی حکم کے ذریعے سے ہے یا اس وجہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کی اشاعت کرتے رہے ہیں۔“

خطیب بغدادی نے ”الکفایہ“ میں بیان کیا ہے کہ دین کے وہ امور جن کا علم قطعی ذرائع سے حاصل ہوا ہے، ان کے بارے میں خبر واحد کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی خبر کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی